



احمق تماشائی

نسرہ احمد

بارش کے قطرے ٹپ ٹپ کھڑکی کے شیشے
پر پھسل رہے تھے۔ کافی دیر ہوئی طوفان ختم چکا تھا اور
اب مینہ کی آخری بوندیں گر رہی تھیں۔ وہ رائٹنگ میبل
کی کرسی پر بیٹھے، قلم انگلیوں میں گھماتے... کسی گہری
سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قلم کا ڈھکن اتار کر
کاغذوں کے اس پلندے پر رکھا ہوا تھا جو ان کے
سامنے میز پر پڑا تھا۔ وہ شاید کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ
نہیں پا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر فکر کی لکیریں عم

کی لکیروں سے زیادہ تھیں۔ عمر بھی کم تھی قریباً پچاس کے لگ بھگ تو ہوں گے۔ پال کھوں سے سفید اور موچھیں سرخی تھیں۔ تنہا زندگی کی ساری داستان پیشانی پر رقم تھی۔

تنہائی اور قلم..... بس دو ہی ساتھی تھے ان کے۔ جب شادی کی عمر بھی تو کوئی پسند نہیں آئی۔ عمر بڑھ گئی تو بہتوں کو وہ پسند نہ آئے۔ اب تو عرصہ ہوا انہوں نے کسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بس اخبار کا دفتر تھا اور ان کی پرانی سوز کی قیہ یہاں سے وقتوں کا اماں، باوا کا چھوڑا ہوا مکان تھا اور قلم تھا۔ زندگی میں ان تین چار چیزوں کے علاوہ ان کا کوئی قیمتی اثاثہ نہ تھا۔ ہاں ایک بہن تھی جو عمر سے امریکا میں مقیم تھی۔ تین چار سال بعد ایک چکر لگاتی، سوئٹرز اور جوڑے لے آتی (شاید وہاں بھی دو چیزیں سستی ملتی تھیں) شادی کر لینے پر یکپہرہ دیتی اور بچوں کو ان کی سوز کی میں سرگرداں ہونے کی اڑان بھرتی۔ وہ روزانہ کا کالم لکھتے تھے۔ کبھی سیاست، کبھی ثقافت، کبھی معاشرت اور کبھی مذہب۔ موضوع ختم نہیں ہوتے تھے سیاسی ختم ہو جاتی تھی۔ کبھی بھارتی سوج بھی ختم ہو جاتی تھی جیسے ابھی وہ قلم کھول کر بیٹھے کچھ نہ لکھ پارہے تھے۔ موضوع تھا ان کے پاس مگر الفاظ جانے کہاں جاسوئے تھے۔ شاید ذہن ٹھنک کا شکار تھا۔ انہوں نے کھلا قلم دھیرے سے کاغذوں کے پلندے پر ڈالا اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی نم ہوا سرعت سے اندر داخل ہوئی تھی۔ کاغذوں کے کنارے پھر پھڑانے لگے تھے۔ انہوں نے جیبر ویٹ اٹھا کر ان پر رکھا اور باہر بھیکے منظر کو دیکھنے لگے جہاں بارش اب دم توڑنے لگی۔

ان کی زندگی کی طرح کمرے کا رخ بھی بد قسمتی کا شکار تھا۔ کھڑکی کے باہر کوئی خوب صورت ہر ابھرا

پہاڑ نہیں، کوئی ٹیلی جھیل نہیں، کوئی سرسبز گھاس اور خوشنما پھولوں سے مزین لان نہیں بلکہ کچی اینٹوں کا چھوٹا سا محن تھا۔ سپاٹ، خشک محن جو گھر کے پچھلی سمت تھا اور اس کے اختتام پر چار دیواری تھی۔ ادھر تمام گھر ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے۔ محن چھوٹے اور کمرے زیادہ تھے۔ دیوار کے ایک طرف کی آواز دوسری طرف بتا کر وقت کے سنی جا سکتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کے واسطے ہاتھ کی طرف واقع گھر سے کافی عرصے سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ پچھلے کمرے والوں نے مکان خالی کر دیا تھا اور کچھ روز پہلے جب وہ راہ چلتے اپنے ہمسائے (مالک مکان) سے ملے تھے تو معلوم ہوا تھا کہ آج کل وہ گھر کی تلافی میں ہے۔

وہ جس رخ پر بیٹھے تھے وہاں سامنے کھڑکی کے باہر تین اطراف دیواریں تھیں۔ ان کے بالمتقابل دیوار پر چھلی روشنی پر رہی تھی۔ غالباً ساتھ والے گھر کے کمرے سے آ رہی تھی۔ درحقیقت یہ گھروں کی بیک سائڈ تھی تو کمرے کے بجائے بالکونی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ معلوم نہیں کس چیز کی روشنی تھی۔ شاید لیپ وغیرہ جلا ہوا تھا۔ یقیناً نئے کرائے دار آگئے تھے۔ وہ ایک اچھٹی نظر اس اندھیرے میں روشن ہوئی دیوار پر ڈال کر واپس کاغذوں کے پلندے کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ ایک دم سے ایک آواز ان کی سماعت سے گزرائی، انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

دائیں جانب والے گھر سے وہ آواز آ رہی تھی۔ گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز، نسوانی آواز جیسے کوئی کم عمر لڑکی رو رہی تھی۔ سامنے دیوار پر روشنی میں انہیں ایک ہبولا سا نظر آیا۔ وہ غالباً بالکونی میں لٹکے لیپ کے آگے بیٹھی تھی، کبھی اس کا سایہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔

انہوں نے کاغذ ایک طرف کیے اور میز سے اپنا نظر کا چشمہ اٹھا کر لگایا۔ منظر اب صاف دکھائی دینے

لگا تھا۔ وہ آنکھیں کھل کر بغور دیکھنے لگے۔ وہ کوئی لڑکی تھی جو گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں کی اونچائی پونی ہوا میں جھول رہی تھی۔ ماتھے پر آگے سے کٹے ہوئے بالوں کا خاکہ سا بنتا تھا۔ اس کا چہرہ اور نقوش تاریکی میں ڈوبے تھے، وہ ہلے ہلے لرز رہی تھی اور اس کی سسکیاں گیلی دیواروں پر اتر رہی تھیں۔ اس کی آواز میں کم عمری کا اظہار پن تھا اور سائے میں ایک دلکش سراپے کی رعنائی تھی۔ وہ بہت درد سے رو رہی تھی جیسے بہت تکلیف میں ہو، اس کا دکھ سارے ماحول پر چھانے لگا تھا۔

بارش ختم ہو چکی تھی مگر اس کے آنسو انہیں ڈبو رہے تھے وہ بیک تک، کم صدمہ بت بنے اس ہلے ہلے کانپتے سائے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کون تھی، اسے کیا غم تھا، وہ اتنی بے بسی اور تڑپ سے کیوں روئے جا رہی تھی، وہ جاننا چاہتے تھے مگر جان نہیں سکتے تھے سو اس طرح بیٹھے اسے دیکھتے رہے جس کا سایہ آدھی دیوار پر محیط تھا۔ شاید وہ لیپ کے بہت قریب بیٹھی تھی۔

کتنے لمحے بیت گئے، وہ پونہی روتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کی سسکیاں گھٹتی گئیں اور پھر ایک دم سے لیپ بجھ گیا۔ سامنے والی دیوار تاریک ہوئی اور ان کا منظر ختم ہو گیا۔ دفعتاً دائیں جانب کے گھر کی بالکونی سے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور پھر چھٹی چڑھنے کی۔ وہ شاید اندر چلی گئی تھی۔ اب وہاں بیٹھنا بے سود تھا۔

کالم کا موضوع اور خیال ان کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے بے دلی سے قلم کو کیپ چڑھائی اور گری دکھیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

صبح چلتے پھرے ان کی ہمسائے سے

ملاقات ہو گئی۔ وہ دراصل ان کے ہمسائے والے گھر کا مالک مکان تھا۔ رہتا ایک لگی چھوڑ کر تھا۔ یہ گھر اس نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔

”رشید صاحب.....“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو روک بیٹھے۔ ”آپ کا گھر کرائے پر چڑھا؟“ ”ہاں جی، اللہ کا شکر ہے، کراچی سے ایک فیملی آئی ہے، پورا گھر انہوں نے ہی لے لیا ہے۔“ ”اچھا، یہ تو اچھی بات ہے، بڑی فیملی ہوگی یقیناً؟“

”ارے نہیں، فیملی تو چھوٹی سی ہے، میاں بیوی اور ایک بیٹی۔ بس امیر لوگ ہیں، پرائیویسی چاہتے ہیں سو پورا گھر لے لیا بلکہ اوپر والا پورا پورشن بیٹی کے لیے ڈیکوریت کر رہے ہیں۔“

”اچھا..... اچھا.....“ اچھے لوگ ہوں گے پھر تو؟

”ہاں جی،“ اور وہ جان گئے تھے کہ یہی ”بیٹی“ رات میں رو رہی تھی۔ ماں، باپ، اتنے بیمار کرنے والے تھے پھر بھی رو رہی تھی؟ جانے کیا بات تھی۔

رات وہ کالم لکھنے بیٹھے تو کچھ سوچ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ کل کی بارش کے باعث آج قدرے صاف تھا۔ باہر تارکی میں ڈوبا تھا۔ محن میں وہ بھی کوئی بھی بتی یا لب نہیں گھوٹا تھے۔ دھیان ہی نہیں دیا۔ کبھی۔ یہ کام تو ویسے بھی بیویوں کی توجہ دلانے پر ہی ہوتے ہیں، خود سے کہاں خیال آ سکتا تھا ان کو۔ البتہ آج ان کو اس بات کی خوشی تھی ورنہ اگر محن روشن ہوتا تو براہروی کے لیپ کی روشنی ادھر نہ پڑتی۔

وہ کالم لکھنے لگے۔ کل کا ناغہ کیا تھا سو آج مستعدی سے قلم چلانے لگے۔ الفاظ بھی تھے، موضوع اور نتائج بھی۔ ابھی درمیان میں ہی پہنچے تھے کہ وہی مدہم نسوانی آواز تاریکی میں سنائی دی۔ قلم روک کر

ماہنامہ پاکیزہ۔ فروری 2012ء

انہوں نے بے اختیار سر اٹھایا۔

سانے دیوار پہ چلی روشنی پڑ رہی تھی اور اس میں ایک سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُسی لڑکی کا سایہ۔ وہ اسی طرح دائیں پہلو پٹھنی تھی۔ اس کی پونی ہوا میں ہل رہی تھی۔ ماتھے پر کئے بال بھی اُدھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ آج وہ سر جھکائے نہیں بلکہ سر اٹھائے بیٹھی تھی۔

”کرسٹوفر!“ وہ گہری تاریکی میں ہولے سے بولی تو وہ چونک اٹھے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

دیوار پر پڑتے زرد رنگ میں آہستہ سے کوئی چلنا ہوا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ وہ لمبا سا لڑکا تھا۔ اس کے بال کھنگڑا لے اور ناک لمبی تھی۔ وہ اب ان دونوں کا سا نڈ پوڑ دیکھ سکتے تھے جو آہستہ سے سامنے موجود تھے۔ لڑکی سر اٹھا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہم ساری زندگی اُدھر بند رہیں گے۔۔۔ کرسٹوفر؟“ وہ بہت دکھ سے کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک سے گئے۔

”مجھے کرسٹوفر مت کہو کیتھی، مجھے کرس کہو، ہمارے ڈیڈ کا بھی تو یہی نام تھا نا۔“ لڑکے کی آواز قدرے بھاری تھی۔

”مگر اب ڈیڈ نہیں رہے اور ہم جیم ہو چکے ہیں۔ اب ہمارا کوئی نہیں ہے۔“

”مما تو ہیں، ممما ہم سے پیار کرتی ہیں کیتھی، ٹرسٹ ہر۔“ ان کے سامنے بالکل ساکت تھے۔ دکھ بھی ایسے ہی ان کے لہجوں میں ٹھہر گیا تھا۔

”مجھے ممما پر بھی ٹرسٹ نہیں رہا۔ وہ جب ہمیں یہاں لے کر آئی تھیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں بس ایک دن اس کمرے میں بند رہنا ہوگا کہ ان کے پاپا کو پتا نہ چلے اور وہ جلد ہی ہمارے نانا کا پیار حاصل کر کے ان کو اپنی وصیت بدلنے پر مجبور کر دیں گی۔ پھر کچھ

دنوں میں نانا مر جائیں گے اور ساری دولت ہماری ہوگی مگر یہاں آکر کیا ہوا؟ ہم کتنے دنوں سے یہاں بند ہیں اور ممما کو ہمارا خیال ہی نہیں۔“

”ممما پر بھروسہ رکھو کیتھی۔“

”نہیں کرس۔۔۔۔۔ ممما اپنے پیڑش کے ساتھ ان کی دولت میں اتنی کن ہیں کہ انہیں بھول چکا ہے کہ ان کے بچے یہاں اور اس چھوٹے سے کمرے میں بند ہیں، اگر اس گھر کو آگ لگ گئی اور ہم سرگئے تو کسی کو علم بھی نہیں ہوگا کیونکہ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اس محل میں صرف مالک، اس کی بیوی اور بیٹی رہتے ہیں۔ لوگوں کو کیا پتا کہ ظالم مالک کے گریڈ چانڈران اور قید ہیں، صرف اپنی ماں کی خود غرضی کی وجہ سے۔“

”یقینی۔۔۔۔۔“ اور پھر وہ بولتے بولتے رکا۔

”کوئی آرہا ہے، چلو۔“ شاید انہیں کوئی آواز آئی تھی جی ایک دم سے لیپ بچھ گیا۔ تھوڑی سی کھنکھڑ ہوئی اور پھر بالکونی کے دروازے کے بند ہونے اور جتنی چڑھنے کی آواز آئی۔

وہ دم بخود سے بیٹھے تھے۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ باہر نکل کر ان کی بالکونی میں جھانک ہی لیں یا صبح جا کر مالک صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا کر سوال کر سکیں کہ ان کی بیٹی نے اپنے بچوں کو اوپر کیوں قید کر رکھا ہے۔ نانا کی وصیت۔۔۔۔۔ چند دن بعد نانا کی متوقع موت۔۔۔۔۔ ماں کی خود غرضی۔۔۔۔۔ قید بچے۔۔۔۔۔ وہ نین اسیجرت تھے۔ پندرہ سولہ سال کے تو ہوں گے، ان کو یوں بند رکھنا تو ظلم تھا مگر وہ کس سے فریاد کرتے۔ کالم جیسے نیچے مکمل کر کے وہ رات گئے کرسی سے اٹھے تو تیند آٹھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

اس رات وہ قلم کاغذ لے کر کھڑکی کے سامنے بیٹھے تو یہ بات طے تھی کہ آج کالم ان سے لکھا نہیں

جانا اور وہ بس اپنی دیوار پر گرتے سائے دیکھنے کے لیے ادھر بیٹھے تھے۔ ٹھٹک دس بجے ان کو دیوار پر روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ انہوں نے بند قلم کپ میں دیکر قلموں کے ساتھ ڈال دیا (آج انہوں نے اسے کھولنے کا بھی تکلف نہیں کیا تھا) اور آگے ہو کر بیٹھے۔ دلچسپ فکر مندی سے زرد روشنی میں ان دو ہیولوں کو دیکھنے لگے۔ لڑکی اسی طرح ایک ساڈ سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی بل دار اونچی پونی ہوا سے ہولے ہولے جھولی رہی تھی۔ آج وہ سر سید سے رکے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں اُس کے مقابل اس کا کھنگڑا لے بالوں والا بھائی بیٹھا تھا۔ کیتھی اور کرسٹوفر۔

”کیا سوچ رہی ہو کیتھی؟“

”میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ہمارے ٹوئز کو دیکھا ہے؟ وہ اب ممما کو س نہیں کرتے بلکہ روز پیر روز کمرہ ہوتے جارہے ہیں۔“

”ٹوئز؟ وہ چونکے تو کیا کیتھی کے ساتھ کوئی اور بچہ بھی قید ہے؟ یقیناً ان کی جڑواں بہنیں یا بھائی۔“

”ہاں، دونوں بہت کمزور ہوتے جارہے ہیں مگر ہمیں سروائیو کرنا ہے کیتھی۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہے اور ہمیں نظرینا۔ ہمیں اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔“

”مما ہمیں کبھی یہاں سے نہیں نکالیں گی۔ وہ اب ہماری پروا کرنا چھوڑ چکی ہیں۔“

”ہمت کرو کیتھی۔“ وہ اسے کافی دیر سمجھاتا رہا مگر اس لڑکی کے لہجے کا کرب اس کی آواز کی بجائے۔ ہر شے ان کی روح پر اتاری چلی گئی۔

انہوں نے کالم لکھنا چھوڑ دیے۔ وہ بس ہر رات اپنی کھڑکی کے سامنے آکر بیٹھ جاتے۔ کمرے کی کھڑکی کے کمرے، دونوں پٹ کھول کر چمکتی دیوار پر

چمکا ہائیں آپ سٹیوں جگ سٹیوں کا پتہ مال مجموعہ

2012ء

سرگزشت

ماہنامہ

فخر سخن

ڈیڑھ سو سال قبل بنگال کی سرزمین پر اردو کی خدمت میں ولی و لکھنو کو چھپاڑ دینے والے شاعر کا زندگی نامہ

قابل تقلید

اس دو شہرہ کی روداد حیات جس نے پاکستانی عوام کی خدمت کے لیے جڑی کو چھوڑا، وہ آدھی صدی سے کراچی میں ہے

ساصری

اس جادوگر کا تذکرہ جس کے جادو نے دونوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا

جمین

ایک فانی کے مریض بچے کی روداد جو اس سال بھی اولیپک گیم میں فتح جیتنے کی تیاری کر رہا ہے

اس کے علاوہ

بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، سچے قصے

معلوماتی کہانیاں، فلمی تاریخ اور اردو ادب کے معماروں کی دلچسپ داستانیں

ایک ایسا شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی کے سال پر اپنا شمارہ بخش کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

ماہنامہ نیا کربلا - فروری 2012ء - 103

102 - ماہنامہ نیا کربلا - فروری 2012ء

حکرت کرتے سائے دیکھتے رہتے۔ ان کی باتیں سنتے رہتے۔ پھر پورا دن سوچتے ہی رہتے کہ کبھی ان کے گھر جائیں یا کم از کم اپنی چھت پر پڑھ کر ان بچوں کو آواز ہی دے لیں اور ان کو جب رات میں وہ باتیں کر رہے ہوں تو باہر صحن میں آکر ایک نظر ان کی بالکونی کو دیکھ ہی لیں۔ جہاں وہ چینی کی مورت جیسے سراپے والی لڑکی بستی ہے، جو اپنی نانی کے مظالم اور ماں کی بے اعتنائی پہ شکوہ کنناں رہتی ہے مگر وہ کبھی یہ ہمت نہ کر سکے نہ زیادہ سے زیادہ ایک روز دوپہر میں ڈرتے ڈرتے صحن میں نکل کر گرون اٹھائی تو دائیں گھر کی بالکونی سنسان پڑی تھی۔ اندر کھلنے والے دروازے تختی سے بند تھے۔ بس ایک کونے میں ایک سیدی میز رکھی تھی۔ شاید وہ اسی پر بیٹھی ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی ہمت نہ کر سکے۔ بلکہ اب تو انہوں نے اپنے گھر کی چھت پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اخبار کے دفتر بھی بس خانہ پرچی کے لیے جاتے۔ کالم سے تادم لے لیا تھا۔ بس روزانہ کو رات کا انتظار رہنے لگا تھا۔ کب دس بجیں اور وہ دونوں بالکونی میں آکر باتیں کریں۔

وہ روز ان کی گفتگو سنتے تھے۔ وہ جس کمرے میں بند تھے۔ اس کے آگے کسی ایک کا ذکر کرتے تھے۔ شاید وہاں کوئی اسٹور روم تھا جہاں بہت چوہے تھے۔ ان کی ہر بات میں ایک ہوتا تھا یا پھر ماں سے نفرت یا نانی کے مظالم یا اپنے بڑواں، بہن اور بھائی کی گرتی حالت۔ پھر ایک روز انہیں ان کی گفتگو سے علم ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی نموجے کا شکار ہو گیا ہے۔ اور اگلی رات وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ ان کا بھائی مر چکا ہے۔ ہاں ان کا بھائی مر گیا اور اس لڑکی کا ہر آنسو ان کے دل پر گرتا رہا۔ وہ کب کیسے اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے، انہیں

علم نہ ہو سکا۔ بس وہ ہر رات کھڑکی کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ کافی کے کپ پر کپ چیتے جاتے، دور کہیں گونجنے والی مدھم سرگوشیاں سننے رہتے۔ کانڈوں کے پلندے پیلے پڑنے لگے تھے۔ بند لگم پر دھول جتنے گئی تھی۔ وہ تھے، ان کی تنہائی کی اور دیوار پر حرکت کرتے سائے تھے۔ زندگی بس یہیں تک محدود ہو گئی تھی۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ جائیں اور ان بچوں کو آزاد کروالیں۔ ان کو اپنے گھر لے آئیں۔ ان کو تحفظ اور پیار دیں۔ اور وہ لڑکی..... اسے وہ اپنائیں۔ کیا وہ جو ان کا دینا ایک نہیں، وہ اگر مسیحی تھی تو وہ اس سے شادی کر سکتے تھے۔ مگر وہ اپنا ان سے شادی کرنے پر کیوں راضی ہوگی بھلا؟ لیکن کیا پتا ہو بھی جائے۔ خوش گمانی میں حرج ہی کیا تھا۔

پھر ایک روز انہیں علم ہوا کہ وہ دونوں اپنی چھوٹی بہن کو لے کر یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ دور کہیں کسی اور شہر جانے کا جہاں ان کی ماں اور نانی ان کو تلاش نہ کر سکیں۔ اگر وہ چلے گئے تو ان کی تنہائیں ادھوری رہ جائیں گی بلکہ ان کی زندگی بھی ادھوری رہ جائے گی۔ وہ بھی خود کو مکمل نہیں کر پا سکیں گے۔ نہیں، انہوں نے ان کو جانے نہیں دینا۔ وہ ان سے بات کریں گے۔ ان کو اپنے پاس بلا لیں گے۔ ان کا ہر طریقے سے خیال رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس رات وہ بہت بے چین سے کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ادھر بالکونی میں کیتھی اور کرس باتیں کر رہے تھے۔

”مما یہاں سے چلی گئی ہیں، ہم ان کا زیور نہیں چا سکتے۔“

”مگر ہمارے پاس تھوڑے بہت میسے تو بڑا ہو گئے ہیں نا کرس، اب ہم یہاں سے نکل سکتے

”نہیں۔“

”کل صبح چھ بجے کی ٹرین ہم پکڑ لیں گے۔“

”کیری کو راضی کرنا مشکل ہوگا۔“ وہ اپنی بہن کی بات کر رہی تھی جس کا بڑواں چند روز قبل جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

”ہم راضی کر لیں گے، تم سامان پیک کرو کیتھی۔“

اور ان سے اب مزید صبر کرنا مشکل تھا۔ اپنی ساری بزدلی، کم ہمتی اور جھجک کو پس پشت ڈال کر وہ اٹھے اور بیڑیوں کی طرف لپکے، انہیں اس لڑکی کو روکنا تھا۔ انہیں اس کو تحفظ دینا تھا، اسے زمانے کی ساری کشن گھاٹیوں سے بچانا تھا۔ اسے اپنے پاس لے آنا تھا۔ وہ تیز تیز بیڑیاں پھلا لے رہے تھے ان کی سانس دھوکھی کے مانند چل رہی تھی۔ اس عمر میں بھانگنا ان کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا مگر وہ تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔

وہ اس کو روک لیں گے، اس کو اپنائیں گے۔ اسے زندگی سے ساری خوشیاں کشید کر دیں گے، اس کے سارے غموں کو مٹا ڈالیں گے ہاں۔ وہ اسے خوش رکھیں گے، وہ اس کے لیے اس کی بہن اور بھائی کو بھی اپنے پاس لے آئیں گے۔ ان کی ظالم ماں اور نانی کو علم نہیں ہونے دیں گے، کسی صورت بھی نہیں۔ چھت کا دروازہ کھول کر وہ باہر آئے تھے۔ ان کی بالکونی اور سائیں کی بالکونی ملی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔

وہ کیتھی کو یہاں سے لے جائیں گے۔ وہ کراچی یا پھر اپنے آبائی شہر ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔ وہاں ان بچوں کی ماں اور نانی ان کو نہیں ڈھونڈ سکیں گی۔ وہ ان کی دس دس سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اپنی بالکونی کے آخری سرے پر آکر وہ رکے۔

بائیں طرف کی بالکونی نیم روشن تھی۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر اس لڑکی کی بالکونی کے بالکل کونے پر وہ میز رکھی تھی۔ اس میز کے ساتھ وہ ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ وہ کیتھی نہیں تھی بلکہ ایک دس گیارہ سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کے کھلے بال کمر پر گر رہے تھے۔ وہ بہت خوبصورت سے اپنی انگلیوں سے بندھے دھاگوں کو اوپر نیچے ہلا رہی تھی۔ دھاگوں کے دوسرے سرے پر میز پر رکھی دو کٹھ چلیوں کے ہاتھ بندھے تھے۔ پہلی کٹھ چلی ایک ہاتھ جتنی گڑبائی تھی جس کی اونچی پونی تھی اور ماتھے پر کٹے ہوئے بال تھے۔ دوسری کٹھ چلی پشت بھر کا ٹھنڈا لے لالوں والا گندا تھا۔ وہ ایک تختے پر ان دونوں کو آنے سامنے بٹھائے لپ کے آگے رکھے ہوئے تھی۔ اس کے قریب ہی ایک کتاب پڑی تھی جس کا سرورق ہوا سے پھر پھر اڑ رہا تھا۔

فلاؤڈن ان کی ایک دھانک بالکل ساکت ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کل صبح چھ بجے کی ٹرین سے ہم جائیں گے۔“

”میں نے سارا سامان پیک کر لیا ہے کرس۔“

وہ باری باری ایک ایک اور مونی آواز نکال کر گفتگو کو آگے بڑھا رہی تھی۔ قریب ہی پڑے ایک کٹھ چلی ڈرامے کے دعوت ناموں کی شمشیری وہ اتنی دور سے بھی پڑھ سکتے تھے۔ وہ ڈراما جس کی سرپرہش وہ کافی دنوں سے کر رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے گردن موڑ کر نیچے اپنی دیوار کو دیکھا جہاں دو خوب صورت سائے گر رہے تھے۔

البتہ کٹھ چلیوں کا دھاگا بہت باریک تھا۔ اس کا سایہ نہیں بنتا تھا۔

